R. No. 2486/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۴ - شمارہ ۴۱ | ایڈیٹر:- آل احمد سرور | یکم نومبر ۱۹۶۵ء

اداریہ

بیرونی زبانوں اور جنوبی ہند کی زبانوں کے شاہکاروں کا اردو میں ترجمہ

کسی زبان کے ادب کو مالا مال کرنے اور اس میں تخلیق کے لیے نئے امکانات پیدا کرنے کا ایک ذریعہ دوسری زبانوں کے شاہکاروں کا ترجمہ بھی ہے۔ اردو میں ترجمے کی روایت ایسی گئی گذری نہیں ہے اور ہمیں دوسری زبانوں کے بہت سے شاہکاروں کے برے بھلے ترجمے مل جاتے ہیں۔ مگر اچھے اور معیاری ترجموں کی تعداد پھر بھی بہت زیادہ نہیں ہے۔ ہمیں اس سلسلے کو تیز کرنا ہے اور اس لیے آج ہم "ہماری زبان" کے پڑھنے والوں سے خصوصاً اور اردو کے ادیبوں سے عموماً ایک اپیل کرنا چاہتے ہیں۔

انجمن کے سامنے ایک تجویز یہ ہے کہ جرمن، فرانسیسی، روسی، ہسپانوی، یونانی، لاطینی، چینی، جاپانی جیسی زبانوں سے براہ راست ترجمے کرائے جائیں۔ انگریزی ادب کے شاہکار تو اردو میں منتقل ہوتے رہے ہیں مگر دوسری زبانوں کے نسبتاً بہت کم ہیں اور ان میں بہت سے انگریزی کے واسطے سے ہیں۔ ترجمے میں اصل کی روح کو برقرار رکھنا بہت مشکل ہے اور اگر ترجمہ در ترجمہ ہو تو عبارات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہم ایسے اشخاص کی ایک فہرست تیار کرنا چاہتے ہیں جو مندرجہ بالا زبانوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان کے شاہکاروں کا اردو میں ترجمہ کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہم ان سے خط و کتابت کرکے ان کی تجویزوں کو اپنی اسکیم کے ساتھ انجمن کی ادبی مجلس کے سامنے پیش کریں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر عابد حسین نے براہ راست جرمن سے بہت اچھے ترجمے کیے ہیں، اور انھیں انجمن اور ساہتیہ اکاڈمی شایع کر چکی ہے۔ اسی طرح سجاد ظہیر، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور محمد حسن عسکری فرانسیسی ادب سے اردو میں ترجمہ کر سکتے ہیں اور ظ۔ انصاری اور انور عظیم روسی ادب کے کچھ شاہکار اردو میں منتقل کر سکتے ہیں۔ مگر ہمیں دراصل ہر زبان کے لیے ایک درجن یا کم سے کم آدھے درجن نام چاہئیں اور خصوصاً لاطینی، یونانی، ہسپانوی، چینی اور جاپانی اچھی طرح جاننے والوں کے نام چاہئیں۔ ان کے مشورے سے ہم بیرونی زبانوں کے شاہکاروں کے ترجمے کا ایک بڑا پروگرام چلانا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ جدید ہندوستانی زبانوں کے جاننے والوں کے نام مطلوب ہیں جو ان زبانوں کے شاہکاروں کا اردو میں ترجمہ کر سکتے ہوں۔ اس سلسلے میں ہم جنوبی ہند کی زبانوں سے آغاز کرنا چاہتے ہیں کیونکہ شمالی ہند کی زبانوں کے تراجم تو کچھ نہ کچھ مل جاتے ہیں، مگر جنوبی ہند کی زبانوں کے تراجم سب ملا کر ایک درجن سے زیادہ نہ ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس تجویز کا گرمجوشی سے خیر مقدم ہوگا اور ادارے اور افراد اس میں تعاون کریں گے۔ یہ کام ایک دن کا نہیں ہے لیکن پروگرام کے تحت شروع کیا جائے تو دس سال میں اچھا خاصا سرمایہ جمع ہو سکتا ہے۔ کچھ نہیں تو پچاس ساٹھ بیرونی زبانوں کے اور پچاس ساٹھ جنوبی ہند کی زبانوں کے شاہکار اردو داں پبلک کے سامنے لائے جا سکتے ہیں اور یہ کام دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ ہو سکتا ہے۔

اس شمارے میں

سیر بین

بہت دنوں سے ہم سیر بین کے کالم کی طرف سے غافل تھے۔ یہ کالم اس توقع پر شروع کیا گیا تھا کہ اس میں ایک نہیں بہت سے لکھنے والوں کا ہاتھ ہوگا، مگر جز قیس اور کوئی بروئے کار نہ آیا۔ اردو میں نہ شاعروں کی کمی ہے نہ افسانہ نگاروں کی نہ طنز نگاروں کی نہ نقادوں کی نہ محققوں کی۔ نہیں ملتے تو ایسے لوگ جو زندگی کے نشیب و فراز سے کچھ نشاط کا مواد اخذ کرسکیں، جو جوش و خروش کے مضحکہ خیز پہلو دیکھ سکیں، جو رومانیت کے منشی کے پاؤں دکھا سکیں، جو بلند بانگ دعووں کا کھوکھلا پن ظاہر کرسکیں، جو انتہا پسندی پر لطیف انداز میں تبصرہ کرسکیں، جو شوخیِ فکر کے نمونے دکھا سکیں، جو اپنے اوپر بھی ہنس سکیں تاکہ دوسروں پر اس طرح ہنستے رہیں کہ ان پر رونا آجائے۔

اس لیے ہم ہماری زبان کے پڑھنے والوں کو سیر بین کے کالم میں لکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہماری شرط صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ جو چیز ہمارے معیار و مذاق کے مطابق ہوگی وہ شایع کی جائے گی اور شایع نہ کرنے کی صورت میں نہ کوئی وجہ بتائی جائے گی نہ اس سلسلے میں خط و کتابت کا سوال ہوگا۔ سیر بین کا کالم نہ کسی کی پگڑی اچھالنے کے لیے ہے نہ کسی کی دستاربندی کے لیے۔ اس میں معلومات کی بھی گنجایش ہے بشرطیکہ وہ نادر ہوں۔ اس میں تبصرہ بھی ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ پُرلطف ہو۔ اس میں زبان اور ادب کے نکات کی بھی گنجایش ہے بشرطیکہ ان میں دلچسپی اور لطف کا کوئی سامان ہو یا ان سے کوئی علمی مقصد پورا ہوتا ہو۔ خالص ادبی اور علمی موضوعات کے لیے ویسے بھی ہماری زبان کے دوسرے صفحے موجود ہیں۔

چند روز ہوئے امریکی اخبار "ٹائم" میں یہ نوٹ پڑھ کر جی بہت خوش ہوا کہ اگر اونی کپڑے اخباروں کے کاغذ میں لپیٹ کر رکھے جائیں تو ان میں کیڑا نہیں لگتا۔ دراصل برسوں پہلے ہم نے اخبار "اسٹیٹسمین" بابت یکم (۱۹۱۸ء) کے کالم میں یہ پڑھا تھا کہ نیفتلین کی گولیوں سے اخبار اسٹیٹسمین کا کاغذ اونی کپڑے محفوظ رکھنے کے لیے بہتر ہے۔ چنانچہ ہم آج تک اس وجہ سے یہ اخبار پڑھتے ہیں اور گرمی آنے پر اس اخبار میں اونی کپڑے لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ نہ گولیاں استعمال کرتے ہیں، نہ ڈی۔ ڈی۔ ٹی۔ ہمارے کپڑے واقعی محفوظ رہتے ہیں۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ نسخہ زیادہ لوگوں کو معلوم نہیں ہے۔ پتے کی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں کمال دراصل روشنائی کا ہے، کاغذ کا نہیں۔ انگریزی اخباروں کے لیے جو روشنائی استعمال ہوتی ہے وہ کیڑوں کو زندہ رہنے نہیں دیتی۔ اس کو کہتے ہیں آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔

اردو اخباروں میں جو روشنائی استعمال ہوتی ہے اس پر کچھ لوگ یہ تجربہ کر دیکھیں کہ کیا ان کیڑوں پر یہ روشنائی اثر کرے یا نہ کرے۔ آخر بہت سے دفتری قسم کے لوگوں پر بھی اثر نہیں کرتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کیڑے صرف انگریزی سے قابو میں آتے ہوں اور اردو جیسی زبان کو خاطر میں نہ لاتے ہوں۔

آل انڈیا ریڈیو سے ایک اور اردو نشریہ

دہلی، ۲۲ اکتوبر۔ آل انڈیا ریڈیو نے مغربی پاکستان کے عوام کے لیے اردو میں آج سے ایک نئی سروس شروع کر دی ہے۔

یہ سروس روزانہ بارہ سے ساڑھے بارہ بجے دن (مغربی پاکستان کے ساڑھے گیارہ بجے سے بارہ تک) جاری رہے گی۔

یہ نئی اردو سروس ۱۶ء۵۷ میٹرس (۱۸۰۵ء کیلو سائیکل) اور ۲۷ء۷۳ میٹرس (۱۰۸۱۰ کیلو سائیکل) پر سنی جا سکے گی۔

مولانا آزاد کے خطوط

ساہتیہ اکادمی مولانا آزاد مرحوم کی تمام تحریروں کو بہ حسن اہتمام شایع کرنا چاہتی ہے۔ ان میں ایک جلد خطوط کی بھی ہوگی۔

جن صاحب کے پاس مولانا کے خطوط ہوں وہ ازراہِ مہربانی اس پتہ پر رجسٹرڈ بھیج دیں۔ ان کی نقل یا فوٹو لینے کے بعد اس کو باحتیاط واپس کر دیا جائے گا۔ خطوط اس پتہ پر جانا چاہئیں: جناب مالک رام صاحب ساہتیہ اکادمی، رابندر بھون، نئی دہلی۔

انجمن ترقی اردو لکھنؤ دفاعی مشاعرہ منعقد کرے گی

لکھنؤ، ۱۰ اکتوبر۔ انجمن ترقی اردو لکھنؤ نے اپنے ایک جلسے میں جو آج صوبائی انجمن کے دفتر میں زیر صدارت جناب امیر حسن صاحب نورانی منعقد ہوا عنقریب ایک دفاعی مشاعرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں حسب ذیل افراد پر مشتمل ایک مشاعرہ کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ مشاعرے کے سلسلے میں اس کمیٹی کو مجاز کیا گیا ہے کہ وہ چندے کی فراہمی، مشاعرے کی تاریخ، انعقاد کی جگہ اور صدارت وغیرہ کا تعین کرے۔ جلسے نے یہ بھی طے کیا کہ انجمن کی طرف سے جوانوں کے لیے تحفے پیش کیے جائیں گے۔

ممبران کمیٹی کے نام مندرجہ ذیل ہیں:۔

امین سلونوی (کنوینر)، ساحر لکھنوی، امتیاز ادیب، محمود محمد رافع ایڈووکیٹ، ڈاکٹر علی عباس زیدی۔ جلسے نے کمیٹی کو مجاز کیا کہ وہ دوسرے افراد کو بھی کمیٹی میں شامل کرسکتی ہے۔

دولتِ مشترکہ کی کتابوں کی نمایش

نہرو اور ٹیگور کی کتابیں بھی شریک

لندن، ۱۳ اکتوبر۔ دولت مشترکہ کی کتابوں کی جو نمایش ہو رہی ہے اس میں پنڈت نہرو، رابندر ناتھ ٹیگور اور آر۔ کے۔ نارائن کی کتابیں بھی رکھی گئی ہیں۔ اس نمایش کا افتتاح دولت مشترکہ کے سکریٹریٹ کے پہلے سکریٹری جنرل مسٹر آرنالڈ اسمتھ نے مارل برو ہاؤس میں کیا، جہاں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس ہوئی تھی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

سرسید کے ادبی تصورات

[۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۵ء کو شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کی طرف سے علی گڑھ میں یومِ سرسید منایا گیا۔ یہ مقالہ اس تقریب میں پڑھا گیا]

ہماری ادبی تاریخ میں سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے ادب اور زندگی کے گہرے تعلق کو سمجھنے کی کوشش کی اور فن کی سماجی قدر و قیمت کو محسوس کیا۔ اس اعتبار سے یہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ تنقید جدید کے جس پودے کو آزاد، حالی اور شبلی نے پروان چڑھایا اس کا بیج دراصل سرسید کے ہاتھوں بویا گیا۔ شعر و ادب کے سلسلے میں سرسید کے خیالات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے یہاں کس قدر اعتدال، سلجھاؤ، ژرف نگاہی اور دور بینی ملتی ہے اور بعض مسائل سے متعلق ان کی رائے اپنے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ صائب اور قابلِ اعتبار معلوم ہوتی ہے۔

آزاد اور شبلی نے اگرچہ نظری طور پر بعض نئے تنقیدی تصورات کو قبول کیا لیکن یہ تصورات ان کے جسم و جان میں حل نہ ہو سکے۔ عقیدے اور عمل کا یہ تضاد ان کی تنقیدوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اور ان کے اسلوبِ بیان میں بھی۔ آزاد کو شکایت ہے کہ ایشیائی شاعر مبالغے کے رنگ کا رہتے ہیں لیکن خود آزاد نے اپنی نثری کتابوں میں کونسی کسر اٹھا رکھی ہے۔ مضمون اور طرزِ ادا یا لفظ و معنی کی وحدت کو نہ تو آزاد نے صحیح طور پر سمجھا اور نہ شبلی نے۔ آبِ حیات ہو یا سخندانِ فارس، شعر العجم ہو یا موازنۂ انیس و دبیر ان کتابوں کی تنقیدی عمارت فصاحت و بلاغت اور روزمرہ و محاورے کی پرانی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے۔ فن کی کلّی حیثیت اور موضوع و اسلوب کی وحدت اور ان کے ناگزیر ربط کا واضح شعور نہ ہونے کی وجہ سے آزاد اور شبلی تاریخ و سوانح کی کتابوں میں لفاظی، افسانہ طرازی، خطابت اور شاعرانہ رنگین بیانی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں سرسید کا ذہن بہت سلجھا ہوا ہے۔ ان کے یہاں موضوع کی مناسبت سے اسالیبِ بیان بدلتے رہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اسی بنا پر سرسید کو صاحبِ طرز ادیب ماننے سے انکار کیا ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ سرسید کی کمزوری نہیں ان کی قوت ہے۔ وہ اسلوب کے اسیر نہیں، اسلوب ان کا اور ان کے خیال کا اسیر ہے۔ سرسید کا اسلوبِ بیان تابع ہے ان تصورات و خیالات کا جو وہ کسی مخصوص موضوع پر ادا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ موضوع بدلتے رہتے ہیں اس لیے ان کا اسلوب بھی بدلتا رہتا ہے۔ اس بات کو اب زیادہ آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں، آیئے خود سرسید کے خیالات دیکھتے چلیں۔

شبلی کی المامون (طبع ثانی) کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"اردو زبان نے بہت ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لیے زبان کا طرز جداگانہ ہو۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول یا قصہ اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔ لارڈ میکالے جو انگریزی زبان کا بے نظیر ادیب ہے اس کے تاریخی مضامین باعتبار فصاحت و بلاغت اپنا جواب نہیں رکھتے مگر شاعرانہ طرزِ ادا کی وجہ سے تاریخی اصلیت کو بہت کچھ نقصان پہنچانے والے ہیں۔"

ایک اور موقع پر سرسید نے مضمون اور اسلوبِ بیان کے ربط و تعلق کو قرآن مجید کے حوالے سے سمجھایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قرآن مجید اسلوبِ بیان کے تنوع اور رنگا رنگی کی عجیب و غریب مثال ہے اور اس کو غور سے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ موقع کی مناسبت سے اسلوب اور آہنگ کس طرح تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ سرسید لکھتے ہیں:

"اداے کلام بمقتضاے اس مضمون کے ہوتا ہے جو ادا کیا جاتا ہے۔ نعیمِ جنت اور عذابِ جحیم ایک طرزِ کلام سے ادا نہیں ہو سکتے اور نہ ایک طرز پر ادا کرنا مقتضاے فصاحت و بلاغت ہے۔ جس وقت کہ ایک مضمون قہر آلود زجر و توبیخ کا بیان کیا جاتا ہے اس کے الفاظ اور لفظوں کی ترتیب اور فقروں کی ترکیب دوسری طرح کی ہوتی ہے۔ اگرچہ جب لوگ اس کو پڑھتے ہیں تو اس وقت صرف وہ لفظ ہی موجود رہتے ہیں اور جس لہجے سے وہ الفاظ ادا کیے گئے ہیں وہ لہجہ موجود نہیں ہوتا مگر اس کے الفاظ اور لفظوں کی ترتیب اور فقروں کی ترکیب اس قسم کی ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں وہی لہجہ پیدا کر دیتی ہے۔ اور جب کوئی مضمون محبت و شفقت اور رحم و عفو کا بیان ہوتا ہے تو اس کے لفظ اور لفظوں کی ترتیب اور فقروں کی ترکیب جدا قسم کی ہوتی ہے۔ اور جب کوئی واقعہ یا حالات بیان کیے جاتے ہیں تو اس کے الفاظ نہایت سادہ اور عبارت سلیس اور سہل الفہم ہوتی ہے۔"

سرسید نے اپنی ان تصانیف کے دیباچے سے اس فطری اسلوب اظہار کو واضح کرنے کی کوشش کی جن کے متعلق مصنف "داستانِ تاریخ اردو" کا کہنا ہے کہ پوری انیسویں صدی میں اپنے موضوعات

[illegible]

کے تنوع اور ضخامت و حجم کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ "تہذیب الاخلاق" میں خود سرسید کے قلم سے مختلف مسائل پر جو مضامین شائع ہوئے ان کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ سرسید کی ان تصانیف یا ان کے مجموعۂ مقالات کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ بتا سکتے ہیں کہ سرسید کے یہاں محض سادگی نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ بڑے فخر کے ساتھ لکھا ہے کہ ان کے ایک انگریز دوست کا کہنا ہے کہ "تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی سے ادا ہو سکتے ہیں۔"

"ہر قسم کے مضامین اور خیالات" کا ذکر، اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے کافی ہے۔

آزاد اور شبلی کے بارے میں یہ بات کہی جا چکی ہے کہ ان کے یہاں نئے تنقیدی تصورات اور پرانے مذاقِ سخن کی پیوندکاری صاف نظر آتی ہے۔ مگر حالی کے یہاں بھی ایک طرح کا تذبذب اور کشمکش ہے وہ کبھی ابن رشیق کی طرف کھنچتے ہیں تو کبھی لارڈ میکالے کی طرف؟ مقدمۂ شعر و شاعری "جدید اردو شاعری کا اعلان نامہ ہو یا منظوماتِ حالی کے جواز کی کوشش، بعض ذہنی تحفظات سے خالی نہیں ہے۔ حالی اپنا تمام زور سادگی پر صرف کرتے ہیں مگر غالب کی پرچھائیں ان کا پیچھا کرتی ہے تو ان کے لیے بھی گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کوشش میں ان کے پچھلے خیالات کی تردید ہوتی ہو تو اس کی انھیں خبر نہیں ہوتی۔

"سادگی ایک اضافی امر ہے۔ وہی شعر جو ایک حکیم کی نظر میں محض سادہ و سہل معلوم ہوتا ہے اور جس کے معنی اس کے ذہن میں بجرد سننے کے متبادر ہو جاتے ہیں اور جو خوبی اس میں شاعر نے رکھی ہے اس کو فوراً ادراک کر لیتا ہے۔ ایک عامی آدمی اس کے معنی سمجھنے اور اس کی خوبی دریافت کرنے سے قاصر رہتا ہے۔"

جب بات اتنی سی ہے اور سادگی ایک اضافی امر ہے تو شاعری کے بیان میں سادگی کو بنیادی پتھر ان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک دو نہیں اس طرح کے کئی مقامات ہیں جہاں حالی کا ذہن صاف نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آزاد اور شبلی کی طرح کہیں کہیں حالی بھی اس طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فن میں موضوع یا مضمون کو الگ چیز سمجھتے ہیں اور الفاظ یا طرزِ بیان کو الگ۔ موضوع اور ادائے بیان کے ناگزیر ربط اور فطری تعلق یا شعر کے تخلیقی عمل کا صحیح ادراک حالی کو ہوتا تو وہ اخلاقی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ نہ لکھتے کہ

"اول تو یہ مضامین خود روکھے پھیکے ہوتے ہیں اور پھر ان کے لکھنے والے نہ تو بیان میں کچھ گرمی پیدا کرنا جانتے ہیں اور نہ پیدا کر سکتے ہیں۔"

اسی طرح اخلاق کو معیار قرار دے کر مرزا شوق کی مثنویوں کو "ام مورل اور خلافِ تہذیب بتاتے ہیں مگر زبان و بیان کی گھلاوٹ، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی پر للچاتے ہیں تو اس خیال کا اظہار کرتے ہیں۔

"افسوس ہے شوق کی مثنویوں کی اس سے زیادہ اور کچھ داد نہیں دی جا سکتی کہ جو شاعری اس نے ایسی ام مورل مثنویوں کے لکھنے میں صرف کی ہے اگر وہ اس کو اچھی جگہ صرف کرتا تو آج اردو زبان میں اس کی مثنویوں کا جواب نہ ہوتا۔"

در اصل اخلاقی اور نیچرل شاعری کا جو سبق حالی نے کرنل ہالرائڈ سے سیکھا تھا وہ خاصا ایک رخا تھا اور اس نے ان کی شاعری اور تنقید دونوں کو متاثر کیا۔ حالی کے اسلوب تحریر میں اعتدال ہو تو ہو ان کی تنقید اپنی تاریخی اہمیت کے باوجود اپنے اندر یک رخا پن رکھتی ہے۔ یہ تنقید افادی مقصد اور اخلاقی معیار کی خاطر ادب کے تخلیقی اور جمالیاتی عمل کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ حالی کے تنقیدی نظریے کا نقص وہاں اور نمایاں ہو جاتا ہے جب "یادگارِ غالب" میں وہ اپنے مقدمے میں پیش کردہ اصولوں کے اطلاق سے کتراتے ہیں اور بار بار معذرتی انداز اختیار کر کے غالب کی شاعرانہ عظمت کے لیے پرانے ہی معیار لاتے ہیں۔ تنقیدی شعور کی خامی اور طبیعت کے اس دو دلے پن کی وجہ سے حالی کی جدید شاعری بھی اکثر اوقات "کچا مال" بن کر رہ جاتی ہے۔ ان کی بعض نظمیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے یہ دماغ سے یا اوپری دل سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں بے کیفی اور سپاٹ پن کے علاوہ خارجی اشیاء اور مظاہر کی طول طویل فہرست اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ نیچرل شاعری اور نیچر کا مفہوم بھی ان کے ذہن میں الجھا ہوا ہے۔ اس کے برعکس سرسید کے یہاں نیچرل شاعری اور نیچر کا بہت واضح تصور ملتا ہے وہ نیچر کو ہر جگہ انسانی فطرت کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور شیکسپیئر کو اس کی مثال میں پیش کرتے ہیں۔ حالی مقدمے میں نیچرل شاعری کی خصوصیت کبھی تو مطابقِ فطرت ہونا بتاتے ہیں اور کبھی عام فہم شاعری اور سادہ طرزِ ادا کو نیچرل شاعری سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ عملاً نیچرل شاعری کے نام سے مناظرِ قدرت کی شاعری کرتے ہیں۔

"برکھا رت" وغیرہ جیسی نظموں میں نیچر کا یہی تصور کارفرما معلوم ہوتا ہے۔ یہ نظمیں خالص بیانیہ اور خارجی ہو کر رہ گئی ہیں اور ان میں تاثیر کا عنصر بہت کم ہے اس شاعری کو نیچرل شاعری

(باقی صفحہ [illegible] پر)

سلام مچھلی شہری

شمیر و سناں اوّل

نہیں میں شبنمیں لفظوں کے جادو میں نہ آؤں گا
ستارِ شاعری کے دشت آہو میں نہ آؤں گا
ابھی کچھ روز بزمِ چشم و گیسو میں نہ آؤں گا
کہ میرا شعلۂ افکار ابھی کچھ اور کہتا ہے!
یقیناً کشورِ تخئیل کا شہزادۂ دل ہوں
خبر ہے مہ جبینوں کو کہ میں بھی جانِ محفل ہوں
مگر میں "سرفروشانِ وطن" میں آج شامل ہوں
کہ میرا سازِ آتش بار ابھی کچھ اور کہتا ہے!
ابھی میرے تصوّر کو گولیوں کی سنسناہٹ دو
مجھے تم راکٹوں کی مضطرب سی گنگناہٹ دو
وہ جے دیوی! مجھے اپنے حسیں قدموں کی آہٹ دو
کہ میرا جذبۂ خوددار ابھی کچھ اور کہتا ہے!
نظارے اے زمینِ ہندوستاں اب بھی سہانے ہیں
خداوندانِ مغرب میری دھرتی کے دوانے ہیں
جنوں کی داستاں پڑھتے زنِ دل کے فسانے ہیں
کوئی "دیوانۂ سرحد پار" ابھی کچھ اور کہتا ہے!
کہو تو پھر خیال و خواب کا فنکار بن جاؤں
وہی اک مطربِ چشم و لب و رخسار بن جاؤں
مگر میرے قلم کی ضد ہے اک تلوار بن جاؤں
وطن سے میرے دل کا پیار ابھی کچھ اور کہتا ہے!

کرم اسعدی

شہیدِ وطن

یہ کس کے جسم کے زخموں پہ مسکراہٹ ہے
یہ کس کے خون کا ہے قطرہ زمیں پہ جلوہ فگن
نگاہِ مہر فلک رشک سے یہ کہتی ہے
کہ آفتاب زمیں پر یہ کون ہے روشن
یہ رنگ و نور یہ نقش و نگارِ رعنائی
یہ مست چہکتے قدم لے رہی ہے کس کی بہار
حیات لاش یہ کس کی ہے سر جھکائے ہوئے
بصد خلوص وفا کس کو کر رہی ہے سلام
یہ کس نے فرض ادا کر دیا محبت کا
وفا کا کس نے کیا آج سربلند مقام
یہ وہ شہیدِ وطن ہے یہ وہ دلاور ہے
جو راہِ زندگیِ جاوداں کا رہبر ہے

اردو کتابوں کا میلہ

اردو کتابوں کا ایک حسین "بک فیئر" بمبئی میونسپل کارپوریشن کے محکمہ تعلیم کے اردو سیکشن کی طرف سے بمبئی کے امام باڑہ میونسپل گرلز اسکول میں منعقد کیا گیا۔

مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس فیئر میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔

یہ نمائش کارپوریشن کے حکام بمبئی کے پبلشرز، ٹیچرس اور طلبہ کے اشتراک سے منعقد کی گئی۔ کارپوریشن کی ایجوکیشن کمیٹی کے چیرمین جناب علی محمد معین صاحب نے افتتاح فرمایا۔ کتابوں کا یہ میلہ اسکول کے چودہ کمروں میں لگایا گیا تھا جن میں سے تین بڑے کمروں میں مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ کی بمبئی برانچ نے مکتبہ کی جدید علمی ادبی اور معلوماتی کتابوں کی نمائش کی تھی اور مختلف چارٹس کے ذریعے اپنے تعلیمی تجربے کا مختصر سا خاکہ بھی پیش کیا تھا۔ مکتبہ جامعہ کے علاوہ علوی بکڈپو، صدیقیہ بکڈپو اور نیا اردو کتاب گھر نے بھی ایک ایک کمرے میں کتابوں کی نمائش کی تھی۔ اس طرح تاجرانِ کتب پر مشتمل ان چھ کمروں میں مختلف موضوعات پر مختلف شکل و صورت مختلف گیٹ اپ اور مختلف رنگ و انداز کی حسین و جمیل کتابوں کا ایک دلکش بازار سا لگ گیا تھا ان کے علاوہ بقیہ آٹھ کمرے جن میں ایک ماڈل روم اور ایک ریڈنگ روم بھی شامل تھے اسکول کے طالب علموں اور معلموں کے مرہونِ منت اور ان کے ستھرے ذوق کے آئینہ دار تھے۔ ان کمروں میں خاص طور سے شعراء ادباء اور افسانہ نگاروں کے جو جستہ جستہ حوالے اور تعارف پیش کیے گئے تھے وہ اپنی مثال آپ تھے۔

نمائش میں کچھ اہم کمیاب کتابیں بھی رکھی گئی تھیں اور ہندستان سے شائع ہونے والے مختلف اردو رسائل و اخبارات اور ان کے خاص نمبر بھی موجود تھے۔ جو نمائش کی افادیت میں مزید اضافہ کا باعث بن گئے تھے۔ مکتبہ جامعہ نے بھی خاص طور سے اس نمائش کے لیے "کتاب نما" اور "پیامِ تعلیم" کے مخصوص ضمیمے شائع کیے تھے۔

نمائش کے افتتاح کے بعد ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں ایجوکیشن آفیسر مادھوی، مشادہ صاحب، ڈاکٹر علی محمد معین صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب اور اردو اسکولوں کے سپرنٹنڈنٹ جناب اے، اے فاروقی صاحب نے تقاریر فرمائیں۔

(مرسلہ ادارہ "مورچہ" گیا)

———٭٭٭———

کے بجائے نیچرل پوئٹری کہنا زیادہ صحیح ہوگا لیکن یہ نیچرل پوئٹری انگریزی کے رومانی شعراء کی نیچر پوئٹری سے مختلف قسم کی چیز ہے اس میں داخلی احساس کا پتہ نہیں محض خارجی تفصیلات کا بیان ہے۔ حالی کے تتبع میں ایک زمانے تک ہمارے یہاں مناظر قدرت سے متعلق اسی طرح کی نظمیں لکھی گئیں جن میں شعریت مفقود ہے اور ان کی افادیت اب محض بچوں کی درسی کتابوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے سرسید کے تنقیدی شعور کا ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد اور حالی کی نظموں کی اس خامی کو انھوں نے محسوس کر لیا تھا سرسید نے انجمن پنجاب کے مشاعرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے بعض نظموں کی تعریف کی اور اس مشاعرے کو اردو شاعری کے حق میں فال نیک قرار دیا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

ہم نے جو نیچر کی بہت ہائے پکار کی تو اب اس کا نا فیہ کچھ تو نہیں رہا بلکہ شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی۔ ہمارے زمانے کے علم ادب میں بہت بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں، واسوختوں، مدحیہ قصیدوں ہجر کے قطعوں اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہیے نہیں وہ بھی نہایت عمدہ مضامین ہیں اور جودت طبع اور تلاش مضمون کے لیے نہایت مفید ہیں مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی کچھ تھا۔ دوسری قسم کے مضامین جو درحقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج نہ تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا ہے۔

اردو زبان کے علم و ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ قائم ہوا یادگار رہے گا۔

گزرنے میں کر سکتے ہیں۔

مضامین بیان واقع اور مضامین نیچر ایسے پاس پاس ہیں کہ ان میں دھوکا پڑ جاتا ہے مگر درحقیقت پہلا دوسرے سے بالکل علیحدہ ہے۔ پہلا تو ایک بیرونی حالت ہے اور دوسرا اندرونی حالت۔ اسی سبب سے وہ طاقت ہے جو دل پر اثر کرتی ہے۔ ابھی تک ہماری قوم کا کلام بیرونی حالت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے مگر ہم کو امید ہے کہ بہت جلد اندرونی حالت تک بھی پہنچ جائے گا۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید آزاد اور حالی کی بہت سی نظموں کو نیچرل شاعری کے بجائے "بیان واقع" کی شاعری سمجھتے ہیں اور ان میں داخلی احساس یا اندرونی کیفیت کی کمی پاتے ہیں۔ نظم بے قافیہ اور رجز کے بارے میں بھی ان کے خیالات دیکھ کر تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک صدی گزر جانے اور علوم جدیدہ کے اس قدر عام ہو جانے کے بعد بھی ہمارے درمیان ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جن کے مذاق شعر میں کہنگی، فرسودگی اور یک رخے پن کو خاصا دخل ہے۔ جو نئی غزل میں پرانی غزل اور نئی نظم میں پرانی نظم کی خوبیاں تلاش کرتے ہیں اور جب نہیں پاتے تو ان کے شعر کا مزہ خراب ہو جاتا ہے۔

سرسید نے عام طور پر اپنی تحریروں میں جہاں "ادب" کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں اس کے ساتھ لفظ "علم" کی شمولیت بھی ضروری سمجھی ہے۔ "علم ادب" کی اصطلاح اس رجحان کی غماز ہے کہ سرسید کے نزدیک ادب محض لذت اندوزی یا تفریح کا آلہ نہیں بلکہ ذہنی بیداری کا وسیلہ ہے۔ یہ محض مسرت نہیں پہنچاتا بلکہ بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔ سرسید انسانی علم و بصیرت کو ادب کے واسطے سے عام کرنا چاہتے ہیں اسی لیے انھوں نے اشراف کی زبان سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں

"اس زمانے میں شہر کے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اردو زبان میں یا تو فارسی کی لغت بہت ملا دیتے ہیں یا فارسی کی ترکیب پر لکھنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اچھی نہیں۔ ان سے اردو پن نہیں رہتا۔"

وہ جامد اور مردہ زبان کے بجائے زندہ اور متحرک زبان کی ضرورت پر زور دیتے ہیں اور اردو زبان میں غیر زبانوں کے الفاظ کے دخل کو مستحسن سمجھتے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں

"بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جو لوگ اس زمانے میں اردو لکھتے ہیں وہ انگریزی الفاظ اپنی تحریروں میں ملاتے ہیں مگر ان کو غور کرنا چاہیے کہ زندہ زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے اور بنتے رہتے ہیں اور جب کوئی زبان محدود ہو جاتی ہے وہ مردہ کہلاتی ہے۔

قرآن مجید کو پڑھو اور دیکھو کہ اس میں کس قدر الفاظ دوسری زبانوں کے داخل ہیں۔ اگر عربی

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

دیویندر پرشاد سکسینہ

مولانا حالی کے دو مکاتیب

مولانا حالی کے مکاتیب کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں اُن میں بیسیوں خطوط شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، یہ مکاتیب اردو کے پرانے گلدستوں، رسالوں اور کتابوں میں محفوظ ہیں۔ اگر کوئی تحقیقی کام کرنے والا ان مکاتیب کو مرتب کرکے شائع کردے تو یہ اردو کی بڑی خدمت ہوگی۔ مولانا کے دو خطوط ملاحظہ فرمایئے، یہ خطوط حامد علی خاں بیرسٹر کے نام ہیں جو اردو کے ممتاز ادیب اور شاعر ہونے کے علاوہ انگریزی کے عالم تھے۔ آپ کی انگریزی تحریر پر اہل زبان کی تحریر کا دھوکا ہوتا ہے۔ حامد علی خاں مرحوم کے یہ خطوط اب تک مولانا کے مکاتیب کے کسی مجموعے میں نہیں شامل ہو سکے ہیں۔

(۱)

پانی پت ۲۶ دسمبر ۱۹۱۰ء

مخدومی جناب خاں صاحب افسوس ہے کہ بسبب علالت کے آپ کے عنایت نامہ کا جواب جس کو میں خود اپنے ہاتھ سے لکھنا چاہتا تھا اب تک آپ کی خدمت میں ارسال نہیں کر سکا امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ جس معاملہ کے متعلق آپ نے نہایت افسوس ظاہر کیا ہے، مجھے بھی آپ سے کچھ کم افسوس نہیں ہوا، مگر چونکہ مجھے ہرگز امید نہیں ہے کہ باوجود مذہبی پابندی کے فریقین کے تعصبات کم ہو جائیں گے۔ اس لیے مجھ پر اس قسم کے واقعات کا چنداں اثر نہیں ہوتا میں نے جل کر ایک شعر میں مذہبی تعصبات کے متعلق اپنا خیال صاف صاف ظاہر کر دیا ہے۔

جو مذہب کی صفائی جب تک
اب مذہب کی صفائی ہو چکی

آپ کی غزل دیکھ کر نہایت تعجب انگیز خوشی ہوئی، باوجود انگریزی کی تعلیم کے اپنے قومی لٹریچر سے اس قدر دلچسپی اور مناسبت کا باقی رہنا خصوصاً ایسی حالت میں کہ قوم کے دیگر تعلیم یافتہ لوگوں میں اس مناسبت اور دلچسپی کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جاتا خرق عادت سے کچھ کم نہیں میں آپ کی اس یاد آوری کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں امید ہے کہ آپ بفضلہ تعالیٰ ہر وجہ بخیریت ہوں گے۔

زیادہ نیاز
خاکسار الطاف حسین حالی

(۲)

پانی پت ۲۳ اپریل ۱۹۱۲ء

مخدوم بندہ نواز شفقت نامہ پہونچا جس کے لفظ لفظ سے عنایت اور محبت ٹپکتی ہے سمندر سے کنارے تنہائی کے موقع پر خاکسار کو یاد فرمانا ایک بڑی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے۔ مومن خاں مرحوم نے اپنے دوست کے حق میں یہ شعر کہا تھا۔

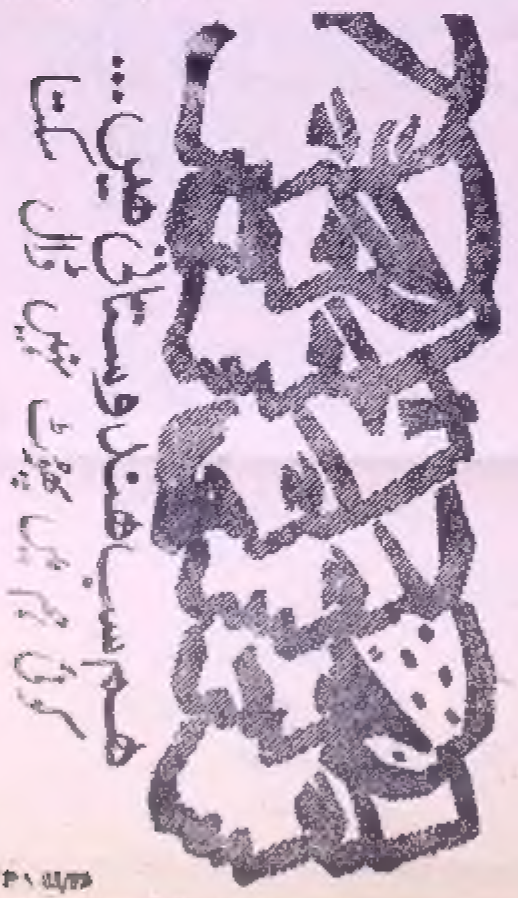
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

میرے ایسے نصیب کہاں کہ آپ جیسے لائق و فائق بزرگ خاکسار کو یاد فرمائیں۔ غزل بھیجنے کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں اس طرح میں مرزا نوشہ صاحب کی غزل ہے شاید آپ نے نہ دیکھی ہو اس لیے اس کے دو تین شعر جو یاد آئے آپ کے ملاحظہ کے واسطے بھیجتا ہوں شعر

نہ لٹتا دن کو تو رات کو کیوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اخیر شعر ان اچھوتے خیالات میں سے ہے جو مرزا ہی پر ختم ہو گئے معلوم نہیں کہ ڈلہوزی میں آپ کب تک قیام فرمائیں گے اور اب مزاج کا کیا حال ہے۔ امید ہے کہ جس موذی مرض کی دوران حال پہلے شکایت تھی وہ اب بالکل زائل ہو گیا ہوگا۔ آخر میں یاد آوری کا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

زیادہ نیاز
خاکسار دعاگو الطاف حسین حالی



مراسلات

انکشافِ حقیقت

"ہماری زبان" بابت یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء کے شمارے میں "قرار دیا سرقہ" کے ذیل میں شفق بھوپالی اور جمیل قریشی صاحبان کے مراسلے نظر سے گزرے۔ شفق صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، غالباً وہ اس لاعلمی کی بنا پر لکھا ہے، جس کی "اصل حقیقت" ان پر واضح نہیں ہے۔ جمیل قریشی صاحب، حقیقت حال سے واقف ہیں اور یہ بخوبی جانتے ہیں کہ احمد رئیس اور فضل المتین میں کیا باہمی رشتہ اور ادبی تعلق ہے۔

میرے لیے یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ میں بطور وضاحت ایک "الزام" کی صفائی میں چند ایسی باتیں کہوں جن کا بیان، کم از کم مجھے نہیں کرنا چاہیے لیکن موجودہ صورت کے پیش نظر، خاموشی کے معنی ہیں "اقرار جرم" —— اس لیے با دلِ ناخواستہ جواباً کچھ کہنے کے لیے مجبور ہوا ہوں۔

بہر حال میں اب بھی اس تفصیلی وضاحت میں نہیں جاؤں گا کہ میری کون سی نظم اور غزل عزیزم احمد رئیس کے نام سے شایع ہوئی اور عزیزم احمد رئیس کی کس نظم اور غزل میں میرا مشورہ شامل رہا ہے۔ البتہ ایک اہم بات ضرور کہوں گا اور وہ ہے احمد رئیس کا وہ "طریقۂ کار" جس سے میں نے ہمیشہ اختلاف کیا ہے۔ اس "طریقۂ کار" کی تفصیلات سے بھی گریز کرتے ہوئے صرف چند ایسی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ جو اردو کے ایسے اہم شعرا کے کلام سے تعلق رکھتی ہیں جنھیں کسی صورت میں بھی احمد رئیس کے مقابلے میں "سارق" قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔

چاند مدھم ہے، آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

ساحر لدھیانوی "گا جائے بنجارہ"

بزم میں چپ ہے، آسماں چپ ہے
درد کی گود میں جہاں چپ ہے

احمد رئیس "ہماری زبان" یکم اگست ۱۹۶۱ء

کس کوچۂ طفلاں میں چلے آئے ہو شاعر
آواز کسے ہے تو کوئی سنگ اٹھائے

حمایت علی شاعر "ہم قلم" کراچی دسمبر ۱۹۶۱ء

کس شہر اداسی میں چلے آئے ہو یارو
سمٹے ہیں یہاں لوگ تو آوارہ دھن سے

احمد رئیس "ہماری زبان" ۱۵ر اگست ۱۹۶۲ء

گو جام وہی، مے وہی، میخانہ وہی ہے

مخدوم محی الدین ۱۹۵۹ء "گل تر"

میخانہ وہی، مے ہے وہی، جام وہی ہے

احمد رئیس "شعلۂ شبنم" دہلی ۱۹۶۰ء

اب آیئے نظم کی طرف۔ احمد رئیس کی ایک نظم "سوال" ہے جو "ہماری زبان" کی ۱۵ر اپریل ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں "حیات نو کے مبلغ سوال کرتے ہیں" اور "صدائے وقت" لدھیانہ کی اشاعت جنوری ۱۹۶۲ء میں "نظام نو کے مبلغ سوال کرتے ہیں" سے شروع ہوتی ہے۔ اہل نظر پر یہ حقیقت واضح ہے کہ یہ نظم "ساحر لدھیانوی" کی کس نظم کا "عکس" ہے۔

اور دیکھیے احمد رئیس کی ایک "گردو پیش" مطبوعہ ہماری زبان (۲۸ر اگست ۱۹۶۲ء) بقول خورشید احمد شمسی "پوری نظم پڑھیے مواد ایک عنوان ایک ہے" (ہماری زبان ۸ر ستمبر ۱۹۶۲ء) اور یہ مصرعے

یہاں نہ شعر سناؤ یہاں نہ شعر کہو

(جذبی)

یہاں نہ گیت سناؤ یہاں نہ نظم پڑھو

احمد رئیس

یہاں ہے حفظِ کتب پر مدارِ فضل و کمال

جذبی

یہاں یہ چند کتابیں کھنگالنے والے

احمد رئیس

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے؟

جہاں تک میری نظم کا تعلق ہے۔ در اصل میری نظم "رات اور دن" بہت پہلے کہی گئی ہے اور اس کے "عینی شاہد" اجمیر کے وہ احباب اور اہل سخن ہیں جو اس نظم کو کئی بار سن چکے ہیں اور وہ مقامی پرچے ہے۔ جس میں یہ نظم، شائع ہوئی ہے۔

آخر میں ایک بات برسبیل "تذکرہ" مجھے خاص طور پر جمیل قریشی صاحب سے کہنی ہے اور وہ یہ کہ۔ میرے یہاں نادانستہ بھی ایسی کوشش کے امکانات ممکن نہیں جو دانستہ طور پر وہ خود کرتے ہیں۔ یہاں میں ان کی صرف ایک نظم "تخلیق" مطبوعہ "سریتا" دہلی ۱۹۶۱ء کا ذکر کروں گا جو در اصل سلیمان اریب "کی نظم" پیشکش "کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہے۔

قارئین "ہماری زبان" "ضیافت طبع" کے لیے دونوں شعرا کی نظموں کا آخری بند ملاحظہ فرمائیں ——

جانے کب تک مجھے اللہ نے شاعر بن کر

شعر نازک کی طرح ذہن میں سوچا ہوگا
جب کہیں دہر کے دیوان مصور میں تجھے
گنگناتے ہوئے گاتے ہوئے لکھا ہوگا

سلیمان اریب ۱۹۴۴ء "پاس گریباں"

جس کے ہاتھوں نے بنایا ہے تجھے
سالہا سال تو سوچا ہوگا
اور پھر اس نے بنا کر تجھ کو
مدتوں پیار سے دیکھا ہوگا

اب میں جمیل قریشی صاحب سے کیا عرض کروں؟

دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ

جمیل قریشی صاحب ابھی یہ بھی نہیں جانتے کہ چوری کسی صاحب "مال و متاع" کے یہاں کی جاتی ہے۔ ان کے یہاں نہیں جو "مانگ کر" اپنا کام چلاتے ہیں۔

سید فضل المتین

حضرت فراق کی ایک غزل

"ہماری زبان" مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء کے صفحہ ۳ پر ادارہ کی طرف سے حضرت فراق کی ایک غزل پر دعوت اظہار خیال دی گئی ہے۔ میں ادبی اعتبار سے بڑی حد تک غیر متعلق ہوں اس لیے نہ فراق صاحب گورکھپوری کے نام گرامی سے مرعوب ہوں نہ ان کے نکتہ چیں طالب زاقی سے مرعوب ہو سکتا ہوں۔ فراق صاحب کی یہ تعلّی کہ تکرار قافیہ کی بالکل نئی قید کے ساتھ یہ دونوں غزلیں کہی گئی ہیں۔ فارسی اور اردو میں ان قیود اور اس التزام کے ساتھ کسی کی کوئی غزل میری نظر سے نہیں گزری اور آپ کی نظر سے بھی نہ گزری ہوگی۔ علم بیان اور عروض کی کتابوں میں بھی اس صنعت کا ذکر نہیں ملتا" ایک خود فریب بڑ ہے۔ کتب عروض کی شہادت ہے کہ مسند الیہ جب مبدل منہ ہوتا ہے تو شاعر بدل لے آتے ہیں اور اہل عروض اسے بدل کل کہتے ہیں۔ بدل کی عروض میں تین قسمیں بتائی گئی ہیں (۱) بدل بعض (۲) بدل اشتمال (۳) بدل غلط۔ اس کے بعد بدل غلط کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ بسبقت لسانی اور بھول چوک میں زبان سے ایک غلط بات نکل جائے تو دوسرا صحیح لفظ لا کر اس کا تدارک کر دیا جائے یہ قسم عوام کے روزمرہ میں مل جاتی ہے۔ فصحا و بلغا کے کلام میں نہیں کیونکہ ایسا بدل صرف غلطی کی وجہ سے واقع ہوتا ہے اور فصحا و بلغا سمجھ کر کلام کرتے ہیں اس لیے ایسی غلطی سے محفوظ رہتے ہیں بدل غلط سے اجتناب واجب ہے کیونکہ یہ مکروہ بات ہے

دوسری قسم یہ ہے کہ فصحا اور بلغا پہلے ایک معنی بیان کرتے ہیں پھر اس سے انحراف کرکے دوسرے معنی کا قصد کرتے ہیں۔ بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اول غلطی ہوئی تھی دوسری بار اس کا تدارک کر دیا گیا ہے۔ لیکن دراصل اس طرح بیان کرنے سے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی مقصود ہوتی ہے یہ قسم بلغا کے کلام میں بہت واقع ہے شعرا بھی مبالغے اور تفنن کے طور پر اس کا استعمال کثرت سے کرتے آئے ہیں مثلاً غلام امام شہید

یہ عبارت "محراب کا خم ابرو سے اشارہ کر رہا ہے کہ اندر جا کر ذرا بہار کا عالم دیکھئے نہیں غلطی ہوئی تجھ سے بلکہ محراب کا اشارہ یہ ہے کہ پہلے حواس کو یہاں طاق پر رکھ جائیے تب آگے قدم بڑھائیے"

آزاد کا یہ شعر بھی اسی قبیل سے ہے ؎

جہاز عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

یار محمد خاں شوکت کا شعر ہے ؎

صدا کوس کی تا بچرخ اثیر
غلط بلکہ "تا گوش کیوان و تیر"

بنا بریں بدل غلط سے عدم وقوف کی پاداش میں اب یہ بیان جاری کر دینا کہ فراق صاحب نے اجتہاد کیا ہے نادانستہ دلیری ہے۔ جہاں تک قافیہ کی تکرار کا علاقہ ہے آج سے لگ بھگ چالیس برس پہلے میں نے امرتسر کے کوچہ صبور ڈار میں ایک نابینا شاعر غلام محمد راحت سرحدی سے ایک غزل سنی تھی جس کے قوافی کچھ یوں تھے :-

ستار تار زنار ۔ حیا ر یار یار ۔ بیمار مار مار ۔ خوبیا ریار، لاچار چار چار ۔ بے زار زار زار ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ یہ اندھے شاعر میری فہرست احباب میں تھے منشی فاضل تھے اور حکیم الشعرا حکیم فیروز الدین فیروز طغرائی امرتسری کے تلمیذ تھے۔ ان دنوں لاہور میں شاید بقید حیات ہوں۔

فراق صاحب کی تکرار قوافی نہ جاندار ہے نہ شاندار اس لیے اس پر خامہ فرسائی غیر ضروری خیال کرتا ہوں۔

غزل کے معترض طالب صاحب زاقی نے قدرے جائز اعتراضات بھی کیے ہیں۔ لیکن عروض ناآشنائی کے طفیل میں دوسروں کو اپنے اوپر ہنسنے کا محل بھی بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر فراق صاحب گورکھپوری کے اس شعر میں غلط اعتراض اٹھا دیا ہے ؎

ادا ادا سے ادا ہو تو ہم ادا سمجھیں
نہیں ادا در ادا جو ادا ادا بھی نہیں

طالب زاقی فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرعے میں "در" کی "رائے مہملہ" تقطیع سے خارج ہو جاتی ہے حالانکہ "در" کا ابتدائی الف

مدغم ہو جاتا ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ خادم اردو زبان کی حیثیت سے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ فراق صاحب گورکھپوری کو اپنا حاصل شدہ مقام جائز رکھنے کے لیے سطحی شیخیاں نہ بگھارنی چاہئیں۔ اساتذہ سلف بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ رہا گناہ والا معاملہ کچھ ان کی ذات پر نہیں پھبتا۔

میں نے اپنے ایک ملاقاتی پر جن کا تخلص بقا تھا اسی فراقی صنعت پر پھبتی کسی تھی وہ یہ تھا۔

ع بقا کو چھوڑیئے حضرت بکا بکانہ بکا

نوٹ۔ ہماری زبان کے اسی شمارے میں انجمن ترقی اردو ہند کی چنڈی گڑھ کی شاخ کے سکریٹری نریش صاحب نے یہ جملہ تحریر کیا "مجلس کا اختتام جناب کرشن کمار طور اور جناب نریش کی غزلیات سے ہوا" اغلاط سے صرف نظر کر کے بھی نریش صاحب کی خدمت میں معروض ہوں کہ "سے" کے ساتھ آغاز ہوتا ہے اختتام کے لئے "پر" لکھا جاتا ہے۔

آغا خلش کاشمیری

کچھ "پری خانہ" پر تبصرے کے سلسلے میں

پری خانہ از واجد علی شاہ مطبوعہ کتاب کار رام پور یو۔ پی پر آپ کے تبصرے نگار م ک (جنھوں نے کسی مصلحت سے اپنا نام ظاہر نہیں کیا) نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے چند امور کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔

تبصرہ نگار نے زیر تبصرہ ایڈیشن کو پاکٹ بک قرار دیا ہے چونکہ اردو والے پاکٹ بک کی حیثیت سے ایک مخصوص سائز سے آشنا ہیں، زیر تبصرہ ایڈیشن کا سائز عام کتابی سائز ہے اس لیے انھیں پاکٹ بک نہیں لکھنا چاہیے تھا۔

انھوں نے اعتراض کیا ہے کہ اس کتاب کا اصل نام "عشق نامہ" ہے اور مترجم نے "پری خانہ" قرار دیا ہے یہ درست ہے مگر اس کتاب کے پہلے مترجم نے بھی اپنے ترجمے کا نام بدل کر "محل خانۂ شاہی" رکھا تھا۔ اور ان کے سامنے بھی اس کتاب کا قطعہ تاریخ تھا جس سے اصل نام "عشق نامہ" معلوم ہوتا ہے اس لیے یہ اعتراض پہلے فدا علی خنجر پر ہونا چاہیے جنھیں تبدیلی نام کے سلسلے میں اولیت حاصل ہے۔

تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ محل خانۂ شاہی پہلی بار ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی لیکن یہ بات غلط ہے اس کتاب کا ایک ایڈیشن جو مہا دیو پرشاد ورما نے کندن لال پریس سے چھپوا کر فروری ۱۹۱۸ء میں شائع کیا تھا ہمارے یہاں رام پور رضا لائبریری میں محفوظ ہے، اس میں خنجر نے اپنے انتساب کی تاریخ تحریر ۱۴ مارچ ۱۹۱۴ء درج کی ہے اس لیے اگر یہ قیاس کیا جائے تو ۱۹۱۸ء کا ایڈیشن پہلی اشاعت نہیں ہے تو بعید نہ ہوگا۔ تبصرہ نگار کی نظر سے ۱۹۱۸ء کا ایڈیشن نہیں گزرا میں نے ۱۹۲۶ء اور اس کے بعد کے ایڈیشن نہیں دیکھے جیسا کہ تبصرہ نگار نے لکھا ہے ۱۹۲۶ء اور اس کے بعد غالباً تین بار یہ کتاب شائع ہوئی اگر اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو کتاب کو پانچ بار شائع ہونا چاہیے ایک بار ۱۹۱۸ء سے پہلے اس لیے کہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک مسودہ غیر شائع شدہ رہنا اتنا قرین قیاس نہیں تھا۔ اس دوران میں اس کا ایک بار شائع ہو جانا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ۱۹۲۶ء کی اشاعت کا حوالہ تبصرہ نگار نے جناب مسعود حسن رضوی صاحب کی کتاب لکھنؤ کا شاہی اسٹیج سے لیا ہے مگر مسعود صاحب نے یہ دعوی نہیں کیا کہ ان کا نسخہ کتاب کی اشاعت اول ہے۔

صاحب تبصرہ "پری خانہ" کی اشاعت سے ناراض ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا کوئی جذباتی تعلق واجد علی شاہ سے ہے اور وہ یہ نہیں چاہتے کہ واجد علی شاہ کی عیاشیوں کی عبرتناک داستان دہرائی جائے وہ "پری خانہ" کو دیپ وانوی کی کتابوں کا ہم پلہ جانتے ہیں ان کے نزدیک اس کی تاریخی اہمیت قطعاً نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک تضاد یہ نظر آتا ہے کہ انھوں نے فدا علی خنجر کے ترجمے کو چھاپنے کی سفارش کی ہے جیسے مترجم کے بدل جانے سے واجد علی شاہ کا اعمال نامہ بدل سکتا ہو۔

فدا علی خنجر اور زیر تبصرہ ترجمے میں کچھ اختلافات ہیں اور تبصرہ نگار اس وجہ سے خنجر کے ترجمے کو قابل اعتبار قرار دیتے ہیں کیا تو خود ان کے پاس جو "نہایت قدیم معتبر نسخہ" ہے اس سے خنجر کا ترجمہ میل کھاتا ہے اگر انھیں تحسین سروری نے جس نسخے سے کام لیا تھا اس کو دیکھے بغیر اپنے مملوکہ نسخے کو زیادہ معتبر سمجھنے کا حق کیسے مل گیا اور انھوں نے اس ترجمے کو کیوں نا قابل اعتبار قرار دے دیا یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

تبصرہ نگار کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نقوش کراچی سے نہیں لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ شاید یہ کتابت کی غلطی ہے۔ اکبر علی خاں

ناگالینڈ میں بزم اردو کا قیام!

ناگالینڈ کا صدر مقام کوہیما ناگا پہاڑیوں پر بسا ہوا ایک خوب صورت شہر ہے۔ یہاں کے اونچے نیچے بل کھاتے ہوئے راستے ان کے کناروں پر آسام ڈیزائن کے بنے ہوئے خوبصورت بکھرے ہوئے مکان، کبھی سورج کی روشنی میں چمکتے ہوئے اور کبھی کہر کی دھند میں چھپے ہوئے (۴۷۰۰) فٹ کی بلندی پر بسا ہوا یہ شہر خوابوں کا شہر محسوس ہوتا ہے۔ اسی خوابوں کے شہر میں آج سے دو سال پہلے ناگالینڈ کی ریاست کے قیام کے بعد ہندوستان کے مختلف گوشوں سے لوگ اس خواب کی بستی میں جوق در جوق اترنے لگے۔ ایک دوسرے سے اجنبی، مختلف زبانیں بولنے والے اپنی اپنی تہذیب و تمدن کے مالک۔ اور ان لوگوں میں اردو بولنے بھی ہیں لیکن ہر ایک کو یہ گمان کہ اردو بولنے یا سمجھنے والا کون ہوگا ایک دوسرے سے ملتے بھی تو غیروں کی طرح بات کرتے بھی تو غیر ملکی زبان میں۔ اور جب غلطی سے کوئی اردو میں ایک آدھ جملہ کہہ جاتے اور درمیانی پردہ اٹھا دیتے۔ تو ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوجاتے اور یہ حسین غلطی آپس کے بندھن توڑ دیتی۔ ایسی ہی حسین غلطیوں نے چند اردو والوں کو ایک مقام پر اکٹھا کر دیا۔ پھر کیا تھا محفلیں جمنے لگیں شعر و شاعری کے چرچے ہونے لگے۔ اپنے اپنے ذہنوں کو کریدا جانے لگا چند چھپے ہوئے ہیرے بھی نکلے۔ کیول کرشن بیتاب، ہنس راج روتن، یوگیندر پال ثاقب نے اپنے گلہائے شعر و سخن سے ادب دوستوں کی گودیں بھر دیں۔ راجندر سنگھ بیدی، راقم مضمون، اور نریندر ناتھ ترکھا نے نثر سے نوازا۔ وہ ان سب سے بڑھ کر سخن فہم نکلے جس کی کمی بے انتہا محسوس ہوتی تھی۔ اور ایک وقت یہ بھی آیا کہ اردو کے شیدائیوں نے یہ ٹھانی کہ بزم اردو کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اردو کے شیدائیوں کے دلوں کی دھڑکنیں زبان تک پہونچیں۔

اور اگست کی حسین شام کو ترکھا صاحب کے دولت کدے پر اردو کے دیوانے مل بیٹھے تو توقع سے کہیں بڑھ کر محفل جمی۔ کہیں چٹکلے، کہیں ادبی لطیفے اور قہقہے، کہیں سنجیدہ اور پرخلوص بحث، کہیں شعر و شاعری اور سخن فہمی کا زور، غرض ایک رنگین سماں تھا۔ اور ہر ایک دل جھوم اٹھا۔ ہر دل نے یہ دعا کی کہ یہ محفلیں یونہی سجتی رہیں۔

اردو کے مدھ بھرے چٹکلے اور خوب صورت شعر یوں ہی لوگوں کے منہ سے نکل کر فضا میں بکھرتے رہے۔ اور اس کا دائرہ وسیع ہوتا رہا۔ اسی محفل میں بزم اردو کی باگ ڈور چند حضرات کے ہاتھوں سونپی گئی۔

صدر۔ جناب ہنس راج روتن نائب صدر راجندر سنگھ بیدی جنرل سکریٹری محمد ابراہیم الدین انصاری خازن۔ نریندر ناتھ ترکھا۔ بزم اردو کا جو چراغ جلایا گیا ہے۔ مخالف آندھیوں سے بچانے کے لیے ان چار حضرات کے کف دست کا سہارا نہ ہونے کے برابر ہے۔ تمام ہندوستان کے اردو دوستوں سے یہ گذارش ہے کہ وہ بزم اردو کو ہر طرح امداد کریں۔ ہمارے ارادے بہت بلند ہیں۔ ہم اس بزم کے دائرے وسیع سے وسیع تر کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس دن کو قریب سے قریب تر لانے کے کوشاں ہیں۔ ہندوستان کے مختلف گوشوں سے شعراء حضرات کوہیما سبزہ زاروں پر رونق مشاعرہ بنیں۔ خدا کرے یہ تمنا حقیقت کا منہ چومے۔ اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب ہم سب تعاون کریں۔

(محمد ابراہیم الدین)

اردو ریسرچ ایسوسی ایشن دہلی یونیورسٹی کا ایک جلسہ

۲۸ر اکتوبر سنہ ۶۹ء کو ٹیوٹوریل بلڈنگ کے آڈیٹوریم میں اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کے جلسے میں جناب صدیق الرحمٰن قدوائی لیکچرار شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے "جان گل کرسٹ اور تدریس اردو" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ پرنسپل ہریش چندر صاحب سابق پرو وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے جلسے کی صدارت کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں انھوں نے موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

قدوائی صاحب نے اپنے مقالے میں گل کرسٹ کی تدریسی کاوشوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ گل کرسٹ نے زبان کی تدریس کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت قواعد کی تعلیم کو دی ہے اس کے نزدیک مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کو سیکھنے کے لیے کوئی آسان یا مختصر راستہ نہیں ہے۔ سب سے پہلے ان کو قواعد کی مہارت حاصل کرنا چاہیے۔ اس کی میزان اقدار میں قواعد کے بعد تلفظ کو اہمیت حاصل ہے۔ وہ اس پر بھی زور دیتا ہے کہ زبان کو عام اہل زبان کے تلفظ اور لب و لہجہ کے مطابق ہونا چاہیے اور اس کے لیے وہ مشق اور عوام سے گہرے رابطے کو ضروری قرار دیتا ہے۔ آخر میں صاحب مقالہ نے گل کرسٹ کے طریقۂ تدریس کے اثرات و نتائج کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تصانیف اور اس کے ممتاز شاگردوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جن میں جان شیکسپیئر اور سر چارلس مٹکاف جیسے نام شامل ہیں۔

مقالے کے بعد بحث ہوئی۔

سکریٹری

شاخ گوالیار کی ایک ادبی نشست

۹ر اکتوبر کی شام کو ۸½ بجے انجمن ترقی اردو ہند شاخ گوالیار کی جانب سے گیان اودے میں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں مقامی اردو ہندی کے ادبا و شعرا حضرات

نے شرکت کی۔

انجمن کے سکریٹری برائے شاخ گوالیار جناب وقار صدیقی اور جناب اسلام الدین قریشی کی قیادت میں یہ نشست گیارہ بجے شب تک چلی۔

نشست کی ابتدا نثری دور سے کی گئی جس میں جناب شفیق رحمانی نے اپنا ایک مطبوعہ افسانہ حاضرین کو پڑھ کر سنایا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

نظم کا دور جناب نعیم گوالیاری کی غزل سے شروع ہوا درمیان میں ہندی اور اردو کے شعرا حضرات اپنی غزلیں اور نظمیں پیش کرتے رہے جو زیادہ تر قومی اور وطنی نظمیں جن میں ملک کی سلامتی کی خاطر جانیں قربان کرنے والے بہادروں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا تو کہیں ملک کے رہنماؤں کو دشمن سے چوکس رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔

(نامہ نگار)

جامعہ اردو سنٹر شیوپوری کا ایک جلسہ

۱۰ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو شام کے ۷ بجے جامعہ اردو علی گڑھ سنٹر شیوپوری کے سنہ ۱۹۶۴ء کے امتحان میں کامیاب ہونے والے طلبا اور طالبات کو تقسیم اسناد کا جلسہ منعقد ہوا جس میں کم و بیش دو سو موجودہ حضرات نے شرکت کی

یہ جلسہ ڈاکٹر چودھری صاحب کی زیر صدارت ہوا۔

ڈاکٹر اقبال کے قومی ترانے:

"سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا"

سے ابتدا بچوں نے کی بعد میں اردو زبان پر چند نظمیں پڑھی گئیں۔ محترمہ شبنم جیزی، ڈاکٹر ڈھینگرا، ڈاکٹر چودھری، ڈاکٹر مہتہ، پنڈت نرہری پرشاد شاستری، سید بشارت علی، خاور جبل پوری نے اردو زبان کی ہمہ گیری اور اہمیت پر تقریریں کیں۔ تقسیم اسناد کے بعد طلبہ اور طالبات کی طرف سے بھارتی حفاظتی فنڈ میں مبلغ اکتیس روپے ڈاکٹر مہتہ صاحب پریسیڈنٹ نگر پالیکا کو پیش کیے گئے۔

(خاور جبل پوری)

صفحہ ۴ سے آگے

زبان کے علم و ادب اور علوم و فنون میں الفاظ جدیدہ شامل ہونے بند ہو جاتے تو وہ بھی مثل عبرانی و سنسکرت و ژند کے مردہ زبان ہو جاتی

سرسید نے اپنے زمانے کی علمی اور ادبی تحریروں میں جس زبان کو رائج کرنے کی کوشش کی وہ دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی اردو سے مختلف تھی اسی لیے ایک جگہ خود سرسید نے اسے "نئی اردو" سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "نئی اردو نے درحقیقت ہماری زبان میں جان ڈال دی ہے۔"

سرسید نے اپنے کئی مضامین میں اس بات کا احساس دلایا ہے کہ قومی اور تہذیبی زندگی میں ادب کا بہت اہم رول رہا ہے انھوں نے متعدد بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "انگلستان کے لوگ ملٹن اور شیکسپیئر پر ناز کرتے ہیں اسی طرح ہمیں بھی اپنے یہاں ایسے شاعر پیدا کرنے ہیں جن پر ہم ناز کر سکیں۔ تعلیم ہی کی طرح انھوں نے ادب کی ضرورت و اہمیت اور اس کی اصلاح و درستی کا بیڑا اٹھایا اور اسے عوام الناس سے قریب لانے کی کوشش کی تہذیب الاخلاق کے ایک اداریے میں" اسپیکٹیٹر" کے حوالے سے یہ عبارت نقل کرتے ہیں۔

"سقراط کی نسبت کہا گیا ہے کہ اس نے فلسفے کو آسمان سے اتارا اور انسانوں میں بسایا مگر میں اپنی نسبت صرف اتنا ہی کہلانا چاہتا ہوں کہ میں نے فلسفے کو مدرسوں، مکتبوں اور کتب خانوں کی کوٹھریوں سے نکالا اور جلسوں اور چار و قہوہ پینے کی مجلسوں تک میں پھیلایا اور ہر ایک کے دل میں بسایا۔"

اس عبارت میں یہ اضافہ کرنے کو جی چاہتا ہے کہ سرسید نے فلسفہ و فکر کو ہی نہیں علم و فن اور شعر و ادب کے ہر شعبے کو آسمان سے اتار کر جمہور کے دلوں میں بسانے کی کوشش کی۔

تصحیح

۱۵ اکتوبر کے "ہماری زبان" میں اوصاف احمد پریمی صاحب کی نظم "آزمائش" کے دس مصرعے پانچ سطروں میں غلطی سے اس طرح شایع ہو گئے ہیں کہ دو مصرعوں پر ایک مصرعے کا گمان ہوتا ہے۔ نظم کی دوسری سطر "ساتھ رہنے کو عمر بھر کے لیے میں جا رہا ہوں مگر مرنے کو" "ساتھ رہنے کو عمر بھر کے لیے میں مگر جا رہا ہوں مرنے کو" پڑھا جائے۔

(ادارہ)

"ہماری زبان"

کو مضامین و مراسلات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیں کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوں۔

(ادارہ)

مالک انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپایا پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا۔